روبینہ الماس*

عبداللہ حسین کے ناولوں میں طبقاتی شعور

عبداللہ حسین اُردو افسانوی ادب میں ایک نمایاں حیثیت کے حامل ادیب ہیں۔ اگر وہ صرف اداس نسلیں ہی لکھتے ،تو بھی ان کی اہمیت بحیثیت ادیب کے مسلم ہوتی کیونکہ یہی ناول آج تک عبداللہ حسین کی پہچان ہے۔عبداللہ حسین کا نام آتے ہی اداس نسلیں خودبخود ذہن میں آجاتا ہےاور اداس نسلیں کے تذکرے کے ساتھ ہی عبداللہ حسین کا تصور قائم ہوجاتا ہے۔ہر ادیب اپنے ماحول اور تخلیقی مواد سے مدد لے کر اپنا سفر طے کرتا ہے۔معاشرے کے تمام اچھے برے پھل ادیب کی جھولی میں گرتے ہیں جن سے وہ اپنی استطاعت کے مطابق تقویت حاصل کرتا ہے۔اس تمام عمل میں مصنف کی معاشرتی حیثیت بہت اہمیت کی حامل ہے۔عبداللہ حسین متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے پنجاب کے کلچر میں آنکھ کھولی اور اس کی گود میں زندگی کی منزلیں طے کیں۔لہٰذا ان کی تحریروں میں پنجاب کا کلچر اور اس کا طبقاتی نظام بار بار ابھرتا ہے۔عبداللہ حسین نے اپنے اردگرد پھیلے ہوئے معاشرے سے جو کچھ حاصل کیا اور جو کچھ سمجھا وہ اپنی تحریروں میں بیان کردیا۔انھوں نے اپنے معاصر معاشرے کے تینوں طبقات، اعلیٰ متوسط اور ادنیٰ، کو نمایاں حیثیت دی ہے، ان کے مسائل کو سمجھا ہے اور زندگی اور معاشرے میں ان کے کردار کو جیسا دیکھا ویسا ہی بیان کردیا ہے۔البتہ متوسط طبقے کو دیگر دونوں طبقات کے درمیان توازن کی شکل میں پیش کیا ہے۔طبقات کی ارضی صورت کو پیش کرتے

ہوئے انھوں نے طبقات کے درمیان موجود کشمکش اور اتار چڑھاؤ کو بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔ یہاں ہم ان کے ناولوں میں موجود طبقاتی شعور کا جائزہ پیش کریں گے۔

عبداللہ حسین کا پہلا ناول اداس نسلیں ۱۹۶۲ء میں منظر عام پر آیا۔اداس نسلیں کا عہد ماقبل ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک پر محیط ہے۔ناول میں بہت سے کردار ہیں جن میں روشن آغا، نعیم، نیاز بیگ، ایاز بیگ، پرویز، عذرا، نجمی، علی اور مہندر سنگھ وغیرہ نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ روشن آغا طبقۂ اشراف سے ہیں اور ان کے بچے اس عہد کی تمام تر ترقی کے حامل کردار ہیں۔نعیم، نیاز بیگ کا بیٹا ہے اور متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔نعیم اپنے طبقے سے اعلیٰ طبقے تک کا سفر طے کرتا ہے اور پھر اپنے طبقے کی طرف واپس لوٹ آتا ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے اندر موجود متوسط طبقے کی حساسیت کو ختم نہیں کر پاتا۔ کہانی تمام تر سفر نعیم کے کردار کے ساتھ طے کرتی ہے۔علی جو نعیم کا چھوٹا بھائی ہے، نچلے طبقے کے نمائندہ کردار کے طور پر ابھرتا ہے۔طبقات کو پیش کرنا ناول کا مقصد نہیں ہے۔ناول میں ایک عہد کی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے جس میں طبقات کی نئی ابھرتی شکلیں دکھائی دیتی ہیں۔

روشن علی خان کو ایک انگریز کرنل جانسن کی جان بچانے کے صلے میں ایک اراضی انعام میں دی گئی۔جس نے روشن علی خان کو جاگیردار بنا دیا اور اس رقبے کو جو روشن علی خان کو حاصل ہوا روشن پور کا نام دیا گیا۔ روشن پور، روشن علی خان کی اولاد کو ورثے میں ملتا ہے۔ روشن آغا، ہر وہ انسان ہے جو اس جاگیر کا مالک بنتا ہے۔

روشن آغا کے محل کی تقریبات میں ملک کے بڑے بڑے جاگیردار (ہندو مسلم) اور انگریز حاکموں میں سے صاحب حیثیت اور باوقار عہدوں کے مالک لوگ، شریک ہوتے ہیں۔انگریزوں اور ہندوستانیوں میں طبقے کا فرق نمایاں طور پر دکھایا گیا ہے۔ روشن محل کی تقریب میں انگریز ایک نمایاں حیثیت میں بیٹھتے ہیں اور ہندوستانی الگ بیٹھتے ہیں۔ یہ تفصیل برعظیم کی طبقاتی روایت اور انگریزوں کے طبقاتی رویے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

نعیم اپنے چچا (ایاز بیگ) کے ساتھ روشن محل کی تقریب میں شریک ہوا تھا اور عذرا سے کسی حد تک متاثر بھی تھا۔اس نے اتنی آزاد اور اتنی فراخ دل لڑکیاں نہیں دیکھی تھیں۔اس کے اپنے طبقے

میں ایسی لڑکیاں تھیں ہی نہیں ۔ وہ جب روشن محل دوبارہ جانا چاہتا ہے تو ایاز بیگ سخت برہم ہوتا ہے اور وہ نعیم کو اپنی حیثیت اور حقیقت سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

> نہیں اب پتہ چل جانا چاہیے ۔ اب تم بچے نہیں ہو ۔ گاؤں میں ہمارا واحد گھر ایسا تھا جو روشن پور کی جاگیر کا مزارع نہیں تھا۔ ہمارا باپ جاگیردار کے گھر جا کر کرسی پر بیٹھتا تھا۔ ایسا ہم نے سنا تھا۔ وہ دلیر اور محنتی شخص تھا۔[1]

کسی کا مزارع نہ ہونا خوشحالی کی علامت ہے اور قابل ستائش بھی ہے۔ انسان جب جب اور جہاں جہاں کسی کا محکوم نہیں ہوتا، وہ خوش بختی کے ساتھ زندگی گذارتا ہے ۔ ایاز بیگ کا یہ احساس کہ وہ کسی کا مزارع نہیں، تسکین کا باعث ہے ۔ دیہاتی زندگی میں زمیندار اور کسان کے درمیان آقا وغلام کا رشتہ ہوتا ہے ۔ وہ لوگ جو اپنی زمین پر خود کھیتی باڑی کرتے ہیں دیہات کی زندگی میں متوسط طبقے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس بات کی صراحت پورے ناول میں موجود ہے۔

عبداللہ حسین نے ہندوؤں کے سب سے نچلے طبقے اور اس کی سوچ پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ مدن جو اچھوت طبقے سے تعلق رکھتا ہے، ہندو سماج کے سب سے نچلے طبقے کا فرد ہے۔ اسے حالات کے بدلنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ نعیم اسے قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ ہم امن وامان اور منظم کوشش سے خاطر خواہ نتائج حاصل کرسکتے ہیں۔ مگر مدن اس سے اتفاق نہیں کرتا ۔

> نیچے جا کر ہم پھر انھی لاکھوں کروڑوں میں مل جائیں جن سے ہم بھاگے ہیں ؟ پھر بیلوں کی طرح کام کریں ؟ تمھیں پتہ ہے وہ کتنی محنت کرتے ہیں اور انھیں کھانے کو کتنا ملتا ہے۔ وہ کتنے گھنٹے کام کرتے ہیں اور کتنے گھنٹے سوتے ہیں ؟ تم نے میرے باپ کو کھیتوں میں کام کرتے ہوئے دیکھا ہے ؟ یا اپنے باپ کو ؟ ان کی انگلیاں ٹیڑھی ہوگئیں ہیں اور پیٹھ کی کھال دھوپ میں جل گئی ہے اور آنکھوں میں پسینہ بہہ بہہ کر وہ اندھے ہوگئے ہیں اور ان پر قرض ہے کہ سات پشتیں ادا نہیں کرسکتیں اور تم نے مالکوں کے مکان دیکھے ہیں اور زمینیں اور مویشی ؟ اور جتنا دودھ روزانہ ان کے گھر میں جاتا ہے اتنا تم نے ساری عمر میں بھی پیا ہے ؟ تم کہاں کی بات کرتے ہو۔[2]

جاگیردارانہ استحصال کے شکار اس طبقے کے لوگ نسل در نسل زندگی اور جاگیردارانہ گورکھ

دھندے میں پھنسے رہتے ہیں۔ ان کے دکھ، ان کی تکلیف کا احساس کسی کو نہیں ہوتا۔ یہ اپنی زندگی کا آغاز ہی مقروض کی حیثیت سے کرتے ہیں اور مقروض کی حیثیت سے مرجاتے ہیں۔ نچلا طبقہ جو زندگی کے لوزامات سے محروم ہے اس کی تکلیف کا احساس کسی کو نہیں ہے۔ مدن کے کردار کے ذریعے عبداللہ حسین نے اس طبقے کی محرومی اور تکلیف کو پیش کیا ہے۔

عبداللہ حسین نے برعظیم میں متوسط طبقے کے پیدا ہونے کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام نے جہاں متوسط طبقے کو پیدا کیا تھا وہاں اعلیٰ طبقے کے پھیلاؤ میں بھی اہم کام کیا۔ جاگیر اب پشتوں کے عمل میں نسل در نسل منتقل نہیں ہورہی تھی۔ لوگ اپنے زورِ بازو سے بھی جاگیریں خرید رہے تھے۔ وہ مہاجن جو سود پر رقم دیتے تھے، پرانے نوابین کی جائیدادیں قرقی کرا کے یا خرید کر جاگیردار بن رہے تھے۔ پھر تاجر پیشہ لوگ سامانِ تجارت سے دولت حاصل کر رہے تھے۔ اس طرح جاگیردارانہ نظام اور سرمایہ دارانہ نظام کے درمیان حریفانہ تعلقات کے ساتھ ساتھ مفادانہ تعلقات بھی استوار ہورہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ انگریز کی وفاداری کی ایک شکل یہ تھی کہ جنگ میں کامیابی سے لوٹنے والے اُن کے نزدیک قابلِ احترام تھے اور جسے آقا عزت دے وہ سب کے لیے قابلِ احترام ہوتا ہے۔ جیسا کہ نعیم کے معاملے میں ہوا۔ اعلیٰ طبقے کی اپنی تہذیب ہے۔ نعیم کو پذیرائی نئی نسل میں حاصل ہوئی یا سرکار انگریز سے، مگر تاجروں اور جاگیرداروں اور سیاسی لیڈروں کے لیے وہ قابلِ اعتنا نہ تھا۔ طبقاتی اختلاف کے باوجود نعیم نے اپنے لیے واضح مقام حاصل کرلیا تھا جس کا اسے بخوبی اندازہ تھا۔ اس کا اظہار روشن آغا کے الفاظ سے بھی ہوتا ہے۔

> 'ہم لوگ ایک ہی نسل کے آدمی تھے۔ نیاز بیگ اور ہم سب۔ اب تم لوگوں کو چاہیے کہ ہم سے ملا کرو۔ نئی نسل کچھ اس قدر بے مروت واقع ہوئی ہے،' وہ اداسی سے ہنسے اور گذر گئے۔ [۳]

اعلیٰ طبقہ جو اپنے سامنے جھکے ہوئے سر دیکھنے کا عادی تھا وہاں نعیم سر اٹھا کر چل رہا تھا اور اپنی حد تک متوسط طبقے کے اس نمائندے نے اعلیٰ طبقے کو شکست دے دی تھی، جس کا عملی مظاہرہ نعیم اور عذرا کی شادی کے نتیجے میں نکلا۔

برعظیم کے اس نئے معاشرے کی سماجیات اور نئی طبقاتی تقسیم انگریز سرکار کی مرضی سے طے پا رہی تھی۔ ملک میں صنعتی (سرمایہ دارانہ) نظام کے تحت جہاں کارخانے تیار کیے جا رہے تھے، وہیں ان کو چلانے کے لیے ایندھن (مزدور) بھی تیار کیا جا رہا تھا۔ ایک ایسا مزدور طبقہ جس میں چھوٹے بڑے کارکنوں کی ایک نئی طبقاتی تفریق موجود ہو۔ اس کے لیے ملوں اور کارخانوں کے ساتھ بستیاں بنائی گئی تھیں۔ جن میں ان لوگوں کو رہائش دی گئی تھی جو ملوں یا کارخانوں میں کام کرتے تھے۔ اس بستی اور اس کے باسیوں کے حوالے سے عبداللہ حسین نے مختصر اور جامع مطالعہ پیش کیا ہے۔

> چھوٹی بستی بڑے مکانوں پر مشتمل تھی اور سبزہ اگانے کی کوششیں زیادہ منظم طور پر عمل میں لائی گئی تھیں۔ چنانچہ اکثر مکانوں کے آگے چھوٹی چھوٹی باڑیں، اکا دکا موسمی پھول، گملے اور کھدرے کھدرے گھاس کے قطعے دکھائی دیتے تھے۔ مکانات جدید طرز پر بنے ہوئے تھے اور بغیر سفیدی کے تھے جس سے مکینوں کی سادگی اور عمدہ مذاق کا پتا چلتا تھا۔ چند ایک برآمدوں کے ستونوں پر بیلیں چڑھنا شروع ہو گئی تھیں۔[۴]

اس طرح کی بستیاں بنا کر اور لوگوں کو رہائش فراہم کر کے سرکار (انگریز) نے دو کام لیے؛ ایک تو ملوں اور کارخانوں میں کام کرنے کے لیے مزدور فراہم ہوئے دوسرے یہ ممکن ہوا کہ یہ لوگ خوشحالی کا احساس کر کے انگریز سرکار کے وفادار ہو جائیں اور انھیں اپنا خیر خواہ سمجھیں، جس سے انگریز سرکار کی جڑیں اور بھی مضبوط ہوں۔ اس طرح کی کوششوں سے معاشرے میں ایک ایسے طبقے اور ماحول کی فراہمی بھی ممکن ہوئی جس نے اس چھوٹی سی دنیا میں مزید ضمنی طبقات پیدا کیے۔ یوں طبقات کے اندر مزید طبقات پیدا ہوئے اور سرمایہ دارانہ نظام کو چلانے کے لیے کل پرزے (کارکن) بھی حاصل ہوئے۔

عبداللہ حسین نے ملک میں صنعتی نظام کے پھیلاؤ اور رویے کو بھی پیش کیا ہے۔ ملوں اور کارخانوں کا اپنا ماحول اور اپنی تہذیب ہوتی ہے۔ جس میں صرف محنت اور جان توڑ محنت ہی سرخروئی کی علامت ہے۔ انسانی ضرورتیں اہم نہیں ہیں۔ صنعتی نظام میں مشینوں کا خیال رکھا جاتا ہے مگر انسانوں کا خیال نہیں رکھا جاتا۔

> مزدور اور کاریگر آٹھ آٹھ گھنٹے کی تین شفٹوں میں کام کرتے تھے، ان میں سے ہر ایک

کو آٹھ گھنٹے مسلسل کام کرنا پڑتا تھا۔ جہاں تک کھانے کا تعلق تھا قانون میں کوئی ایسی شق نہ تھی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ کھانے کی اہلیت بھی رکھتے تھے — چنانچہ "فیکٹری ایکٹ" میں کھانے کا عدم ذکر! — لیکن کھانے پر چونکہ عام لوگوں کی زندگی کا دارومدار ہوتا ہے اس لیے، جب افسروں کے لیے دوپہر کے وقفے کا گھنٹہ بجتا تو وہ لوگ بھی مشینوں پر نظر رکھے ہوئے، اپنے اپنے کام پر چوکس بیٹھے جلدی جلدی کھانا کھا لیا کرتے اور ان کے فورمین، کہ خود بھی کھانا کھاتے تھے، ان کی ان چھوٹی موٹی کتاہیوں کو نظر انداز کردیا کرتے۔[۵]

"ان کی ان چھوٹی موٹی کتاہیوں کو نظرانداز کر دیا کرتے" معنی خیز جملہ ہے۔ یہاں عبداللہ حسین ہمیں صنعتی نظام کی بے حسی پر طنز کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ مجموعی طور پر عبداللہ حسین نے اس ناول میں طبقات کی عمومی اور خصوصی دونوں صورتوں کی تصویر کشی کی ہے جو ان کے طبقاتی شعور کی دلیل ہے۔

عبداللہ حسین کا دوسرا ناول باگھ ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا۔ یہ ناول علامتی واستعاراتی نوعیت کا ہے۔ عبداللہ حسین نے ناول میں خوف کے پھیلاؤ کو پیش کرتے ہوئے افرادِ معاشرہ کے طبقاتی رویے کو بھی پیش کیا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار اسد ہے جو متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہے اور بچپن سے اپنے اندر خوف محسوس کرتا ہے، ہار جانے کا خوف، ڈوب جانے کا خوف، مجرم ثابت ہونے کا خوف، موت کا خوف اور یاسمین کو کھو دینے کا خوف۔ ناول کے دوسرے کرداروں کو بھی خوف کے زیرِ اثر دکھایا گیا ہے۔ یاسمین کو اور گمشد کے لوگوں کو یہ خوف ہے کہ ان کے علاقے میں باگھ آگیا ہے اور وہ سب کسی نہ کسی طرح اسے مار دینا چاہتے ہیں۔ ناول میں باگھ مارشل لا کی علامت بھی ہے۔ مخصوص نوعیت کی ڈکٹیٹر شپ بطور استحصالی طبقہ نمایاں ہوتی ہے۔

اسد سانس کے مرض میں مبتلا ہے اور گمشد میں حکیم محمد عمر سے اپنا علاج کرا رہا ہے۔ حکیم کے پاس اور بھی لوگ ہیں جو ایک دوسرے کی دوائیاں کوٹتے اور پیتے ہیں۔ اسد بھی دوا کی بوٹی پیتا ہے۔ حکیم باری باری سب کی دوا چیک کرتا ہے اور نئی ہدایات جاری کر دیتا ہے۔ حکیم ایک متمول انسان ہے جو گمشد میں عرصے سے رہ رہا ہے۔ اس کے بارے میں مختلف لوگ اپنی اپنی رائے رکھتے ہیں:

'مجھے یہ سمجھ نہیں آتی'، اسد نے کچھ اپنے آپ سے کچھ میر حسن سے سوال کیا، 'کہ یہ سارا بکھیڑا اس نے کیوں پال رکھا ہے۔ فرض کرو کہ دوسرے حکیموں کی طرح یہ ہم سے دوائی کی قیمت وصول کرتا ہے تو اس کے پاس تو پیسے ہی اتنے ہو جائیں گے کہ کام کاج کے لیے کئی نوکر رکھ سکتا ہے۔'

'کام کاج!' میر حسن ہنسا، 'اسے تو غلام چاہئیں، جن کے گلے میں رسا ڈال کر مطب میں باندھے رکھے۔ نوکر تو آزاد لوگ ہوتے ہیں۔'[۹]

یہاں حکیم کا کردار بطور آقا (اعلیٰ طبقہ) کے ابھرتا ہے اور اس کے پاس کام کرنے والے لوگ بطور غلام (نچلا طبقہ) اپنی شناخت کراتے ہیں۔ نفرت ہمیشہ نیچے سے اوپر کی طرف سفر کرتی ہے۔ میر حسن بھی ایسا ہی کردار ہے جو اپنی شناخت نچلے طبقے کے فرد کے طور پر کراتا ہے اور حکیم سے جو اس کے لیے اعلیٰ طبقے کا نمائندہ ہے، نفرت کرتا ہے۔ اعلیٰ طبقہ ہمیشہ نچلے طبقے کا استحصال کرتا ہے اور اس کی محنت کا پھل کھاتا ہے۔ حکیم اپنے مطب میں میر حسن جیسے لوگوں کی محنت حاصل کرتا ہے؛ جس طرح زمیندار کچھ اناج کے عوض کسان (کھیت کے مزدور) کی محنت حاصل کرتا ہے۔ معاشرے میں چھوٹے بڑے مختلف النوعیت طبقات موجود ہیں۔ حکیم اور اس کا مطب اسی نوع کی طبقاتی تقسیم کو پیش کرتا ہے۔ عبداللہ حسین نے حکیم کے ذریعے طبقات کی ایک اور شکل کو پیش کیا ہے۔ اسد ساری صورتحال سے تنگ آ کر اور کم افاقے کی بنا پر گمشدہ چھوڑ کر چلا جاتا ہے مگر اس کا سانس پھر خراب ہو جاتا ہے اور اسے سوائے واپسی کے کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

اسد جب ''گمشدہ'' واپس آتا ہے تو علاقے میں باگھ کے آنے کی خبریں ہر طرف پھیلی ہوئیں ہیں۔ اس علاقے کے لوگوں کو ایک بندوق کی ضرورت ہے جو ان کی معلومات کے مطابق حکیم کے پاس ہے۔ مگر حکیم یہ کہہ کر انکار کر دیتا ہے کہ اس کے پاس کوئی بندوق نہیں ہے۔ پھر رات ڈھلنے پر حکیم مطب میں مردہ پایا جاتا ہے جب کہ میر حسن گھبراہٹ میں یہ کہتے ہوئے کہ اس نے کچھ نہیں کیا، باہر نکل جاتا ہے۔ اسد اس موقعے کا گواہ ہے۔ وہ بھی شک کے دائرے میں آجاتا ہے۔ اسد بندوق کی موجودگی چھپانا چاہتا ہے اس لیے میر حسن کا نام نہیں لیتا۔ لہٰذا شک کا دائرہ تنگ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کو جیل میں بند کر دیا جاتا ہے اور اس پر ناروا و بے جا تشدد کیا جاتا ہے۔ قتل کے حوالے سے یاسمین کے

بیان میں رد و بدل کر کے بیان کو اسد کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے اور اسد کو حبس بے جا میں رکھ کر انسانیت سوز ذہنی وجسمانی تشدد کیا جاتا ہے اور پھر ایک دن ذوالفقار جو خفیہ انٹیلی جنس سے تعلق رکھتا ہے اسد سے ملنے آتا ہے۔ ذوالفقار کی باتیں اسد کو اپنی طرف مائل بھی کرتی ہیں اور حیران بھی ۔ ذوالفقار، اسد کو قانون اور زندگی کی حکمت بتانا چاہتا ہے اور اسے بچ نکلنے کا راستہ بھی بتاتا ہے۔ مگر اسد اس کی باتیں نہیں سمجھتا۔

> مگر میری حالت سے ان باتوں کا کیا تعلق؟ اس نے کہا، ''عہد اقتدار قانون، میرا ان سے کیا واسطہ؟ میں تو یہاں —'' اس نے ہتھکڑی کی زنجیر کو جھٹکا دیا — ''قید ہوں اور مجھ پر تشدد ہو رہا ہے۔ مجھے آج تھانیدار نے بتایا ہے کہ سرکاری طور پر میری گرفتاری ہی عمل میں نہیں آئی۔ گویا میں یہاں پر موجود ہی نہیں ہوں ۔ یہاں کوئی سننے والا نہیں؟ ''[۲]

اس اقتباس سے صاحب اقتدار کا استحصالی رویہ عیاں ہوتا ہے۔ مخصوص قسم کی ڈکٹیٹر شپ انسانوں کو اپنی مرضی سے استعمال کرتی ہے اور بطور انسان ان کا حق تلف کر دیتی ہے۔ اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ ذوالفقار اس استحصالی طبقے کا ایک مہرہ ہے، جو اسد کو آزادی (جیل سے نجات) کے عوض اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے اور آخر کار آزادی کے عوض اسد کو اس کے مقاصد پورے کرنے پڑتے ہیں۔

اس ناول میں عبداللہ حسین اسد کے کردار کے ذریعے معاشرے کے اوپری طبقات کو خوف و ہراس کی فضا قائم کر کے نچلے طبقوں کو اپنے زیر نگیں کرتے اور ان کے حقوق کو کچلتے ہوئے دکھاتے ہیں۔

عبداللہ حسین کا ناول قید ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔

قیـــد کی کہانی پنجاب کے موضع رکھوال کے گرد گھومتی ہے۔ مرکزی کردار پیر کرامت علی کا ہے، جو متوسط طبقے سے اعلیٰ طبقے میں منتقل ہو چکا ہے۔ پیر کرامت علی نے اپنی ارادت کے ذریعے یہ مقام حاصل کر لیا ہے کہ دور دور تک اس کے مرید موجود ہیں۔ کہانی میں ہر طبقے کی ضعیف الاعتقادی کو نمایاں کیا گیا ہے۔ نچلا طبقہ، متوسط طبقہ، اعلیٰ طبقہ اور بیورو کریٹ ہر طبقہ پیر کرامت علی کے یہاں اپنی

بساط کے مطابق رسائی رکھتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ پیر کرامت کی دولت، شہرت اور اقتدار، اعلیٰ طبقے اور بیوروکریٹ طبقے کی مرہونِ منت ہے۔

> پیر کرامت علی، جنھیں خلقت خدا بابا پیر کے نام سے بھی یاد کرتی تھی اپنی بیوی اور بچے کی زبان سے فقط شاہ جی کہلاتے تھے ...... کرامت علی شاہ کے بارے میں ایک غیر معمولی بات یہ تھی کہ وہ کبھی اپنے گھر کے اندر نہیں سوتے تھے۔ کبھی بھولے بھٹکے آ نکلتے تو بچے کی ماں کے کمرے میں بیٹھ کر اس سے ایک آدھ گھڑی کوئی بات کر لیتے، ورنہ ہمیشہ حجرے میں رات بسر کرتے، سوائے سال کے ایک دو موقعوں کے جب وہ دورے پر آس پاس کے گاؤں میں اپنے چند ایک بڑے بڑے مریدوں کے ہاں قیام کی غرض سے نکلتے۔ اس دورے کا مقصد مریدوں کو زیارت سے نوازنا تو تھا ہی، اس کے علاوہ نئے معتقدین کو وعظ و نصائح اور بیعت کا موقع فراہم کرنا بھی ہوتا تھا۔ دورے کے اختتام پر پیسے کے علاوہ بہت سا چڑھاوے کا مال بھی آتا جس کو لنگر خانے میں داخل کر دیا جاتا۔[۸]

پیر کرامت علی کی شہرت اور دولت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ پیر جسامت علی کو اپنی شہرت کے لیے خطرہ محسوس ہوا۔ اس نے ایک محاذ کھڑا کر دیا کہ پیر کرامت علی بے مرشد ہے۔ عملی طور پر بھی دونوں طرف جھگڑا ہوا۔ پھر کچھ لوگوں نے صلح کرا دی اور دونوں کے علاقے تقسیم کر دیے گئے۔ یہ صلح بھی ایسی ہی صلح ہے جیسی اعلیٰ طبقے کے افراد مفادات کی خاطر کر لیا کرتے ہیں مگر دل سے کبھی ایک ساتھ نہیں ہوتے۔ پیروں کے بھی طبقات وضع ہو گئے ہیں اور حلقۂ اثر بڑھتے بڑھتے حصولِ اقتدار تک پہنچ جاتا ہے۔

> ایک زمانہ پھر ایسا آیا ملک میں جرنیلوں کی حکومت ہو گئی۔ جس طرح سیاست دانوں نے اسلام اور توحید کے مبارک نام پہ قوم کو یکجا رکھنے کی کوشش کی تھی، جب جرنیل سیاست پر قابض ہوئے تو انھوں نے بھی یہ بنا بنایا حربہ مستعار لے لیا — صدرِ مملکت پیر پرست جرنیل تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی فوج کے سینئر افسران نے بھی مرشد پکڑنے شروع کر دیے۔ اس زمانے میں کرامت علی شاہ کی مرشدی خوب چمکی۔ اس کی انگریزی تعلیم، حالاتِ عالم میں اس کی دلچسپی اور جدیدیت کا انداز جو کرامت علی شاہ

انھی لوگوں کے لیے مخصوص رکھتا تھا، اس طبقے کو بھا گیا۔[9]

پاکستانی معاشرے میں ایسی چیزیں جن کا حقیقت اور اصلیت سے کوئی تعلق نہ ہو، خوب پنپتی اور پھلتی ہیں۔ پیر کرامت علی اعلیٰ طبقے سے بیوروکریٹ طبقے میں داخل ہوگیا مگر اس کے دل میں سیاست میں آنے کی خواہش باقی رہی۔ سیاست میں آنے کا شوق عہدِ نوجوانی سے اس کے اندر موجود تھا، بلکہ کالج کی زندگی میں وہ سٹوڈنٹ یونین کا ممبر بھی رہا تھا۔ کالج میں اس کی دوستی فیروز شاہ سے ہوگئی۔ دونوں ذہین تھے اور سیاست سے وابستہ تھے، دونوں کی دوستی وقت کے ساتھ بہت گہری ہوگئی؛ قطع نظر اس سے کہ فیروز شاہ کا تعلق نچلے طبقے سے تھا۔

> فیروز شاہ ایک پیش امام کا بیٹا تھا۔ اپنی معمولی حیثیت کے باوجود فیروز شاہ بھی کرامت علی کی مانند قدرتی اوصاف سے مالا مال تھا۔ سکول کے زمانے سے ہی ان دو بچوں کی آپس میں دوستی تھی اور ساتھ ہی ساتھ رقابت کا انداز بھی تھا۔[10]

کالج میں کرامت علی اور فیروز شاہ کی دوستی اور گہری ہوگئی۔ کالج ہی میں ان کی نظر رضیہ سلطانہ پر پڑی، جو بہت مختلف لڑکی تھی اور کالج کی سیاست میں سٹوڈنٹ یونین کی سرگرم رکن تھی۔ دونوں رضیہ کو پسند کرتے تھے مگر رضیہ کا جھکاؤ فیروز شاہ کی طرف تھا لہٰذا کرامت علی سبکدوش ہوگیا۔ رضیہ متوسط گھرانے کی لڑکی ہے اور ایک ریٹائرڈ افسر کی بیٹی ہے۔ جب کرامت علی اس سے پوچھتا ہے کہ وہ فیروز شاہ سے شادی کیوں نہیں کرتی تو وہ جواب دیتی ہے۔

> تم لوگوں کو دنیا بھر کی فکر لگی رہتی ہے۔ عوام عوام کرتے تمھاری باری نہیں آتی۔ ذرا بتاؤ عوام کون لوگ ہوتے ہیں؟ — "سنو۔ ایک بار میں نے فیروز شاہ سے یہ سوال پوچھا تھا۔ اس نے بھی یہی جواب دیا تھا۔ پھر میں نے دوہرا کر پوچھا تو بولا، غریب لوگ، ریڑھی والا، تانگے والا، رکشا چلانے والا میں نے پوچھا اور؟ تو بولا سٹیشن کا قلی، ڈاکیے، بس ڈرائیور پھر میں نے پوچھا اور؟ بولا پھیری لگانے والے، لوہا کوٹنے والے، بجلی کا میٹر پڑھنے والے، کرسیاں بنانے والے، پولیس کے سپاہی، چارپائیاں بننے والے، برتن قلعی کرنے والے۔ میں نے پوچھا اور تو چڑ گیا۔ بولا کیا اور اور لگا رکھی ہے۔ کیا مطلب ہے تمھارا؟ میں نے کہا اور عورتیں؟ اس پر وہ کچھ حیران ہوا۔ پھر بولا، ہاں عورتیں۔ میں اس وقت ہنس دی۔ بیچارے نے بے خودی میں کچی بات کہہ

دی تھی۔تمھارے عوام میں ہم لوگ کہاں شامل ہوتی ہیں۔"[۱۱]

رضیہ کے کردار کے ذریعے عبداللہ حسین نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ عورت بھی معاشرے کا طبقہ ہے جسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ رضیہ عورتوں کے حقوق کی علمبردار ہے۔عوام میں عورت شامل نہیں ۔معاشرے میں ہر طبقہ موجود ہے۔سب عوام ہیں۔مگر عورت کسی طبقے کا حصہ نہیں اس لیے عوام بھی نہیں ۔ دراصل رضیہ سماج کی اس بے انصافی پر طمانچہ ہے۔وہ فیروز شاہ سے محبت کرتی ہے مگر شادی نہیں کرتی کہ وہ عورت کو عوام میں شامل ہی نہیں سمجھتا تو ان کے حقوق کے لیے کیا کام کرے گا۔اس ضمن میں ڈاکٹر خالد اشرف لکھتے ہیں:

> رضیہ میر دراصل ایک ایسے سماج میں پابندی، جبر اور گھٹن کی زندگی گذار رہی ہے جہاں مذہب اوراخلاقیات کے جملہ حقوق مردوں نے اپنے نام محفوظ کرالیے ہیں اور شریعت و قرآن کے احکامات کی تفسیر و تعمیل بھی اپنے طبقے کے لیے وقف کر لی ہیں۔ یہاں تک کہ دنیا بھر کے کمزوروں اور استحصال زدہ طبقوں کے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے والے انقلابی بھی کبھی کبھی طبقۂ نسواں کے فروغ اور آزادی کے مسئلے کو نظر انداز کرجاتے ہیں — اسی لیے رضیہ اس سے محبت کرنے کے باوجود شادی کے لیے راضی نہیں ہو پاتی کہ وہ اسے اپنے برابر کے انسانی حقوق اور مساوات پر مبنی باعزت مقام دینے کا اہل نہیں تھا۔[۱۲]

قیـــــد میں وہ تمام طبقات پیش کیے گئے ہیں جو معاشرے کی زیریں سطح پر موجود ہیں اور جنھیں ہم نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ عبداللہ حسین کی نظر کی وسعت و گہرائی ہے کہ وہ معاشرے میں اس طرح کی صورتحال کو بھی مدنظر رکھتے ہیں۔نیز طبقات کی ایک قطعی مختلف نوعیت کو پیش کرتے ہیں۔

نادار لوگ قید کے دس سال بعد ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا۔نادار لوگ کا عہد تقسیم ۱۹۴۷ء سے شروع ہوتا ہے۔ناول پاکستان میں سماجی ارتقا اور سیاسی جوڑ توڑ کا احاطہ کرتا ہے۔نیز سقوطِ مشرقی پاکستان سے کچھ بعد تک کے حالات پیش کرتا ہے۔ نادار لوگ میں عبداللہ حسین نے پاکستان کے نئے بنتے بگڑتے معاشرے میں ذات برادری،نسلی امتیازات، مہاجرین کی رہائش کے مسائل کے ساتھ معاشرے میں موجود اوپری بالائی طبقوں اور نچلے متوسط طبقوں کا احاطہ بھی کیا ہے۔نیز فوج اوراس کے

عمومی رویے کا بھی احاطہ کیا ہے۔

ناول کا ہیرو سرفراز ہے مگر اس کا مرکزی کردار ہر لحاظ سے اعجاز ہے۔ اعجاز کو ناول کا سب سے متحرک کردار کہا جاسکتا ہے کیونکہ ناول نگار نے اعجاز کے ذریعے تعلیمی ادارے سے لے کر حکومتی اداروں تک، سب کی سیاست اور معاشرتی مقام کا احاطہ کیا ہے۔ اعجاز ذات کا اعوان ہے اور معاشرے میں اس کی حیثیت متوسط طبقے سے لے کر اعلیٰ متوسط طبقے تک استوار ہوتی ہے۔ اعجاز ایک سیدھا سادہ سکول ماسٹر ہے اور اسی سکول میں اس سے پندرہ سال چھوٹا بھائی سرفراز زیرِ تعلیم ہے۔ اعجاز کی زندگی اچانک پن (happening) سے عبارت ہے۔ وہ کسی بھی صورتحال کا انتخاب خود نہیں کرتا بلکہ ہر بار صورتحال اس کا انتخاب کرلیتی ہے۔ اپنے رویوں کو مثبت رکھتے ہوئے زندگی کو بھرپور انداز میں بسر کرتا ہے اور اس کے ہر طرح کے حالات میں اس کی بیوی سکینہ، اس کا بھرپور ساتھ نبھاتی ہے۔ اعجاز اور سرفراز کا باپ یعقوب اعوان ہجرت کر کے پاکستان آیا تھا۔ وہ سرحد کی دوسری طرف اپنی اراضی چھوڑ آیا تھا جس کا خیال یعقوب کے ذہن میں تھا۔

> "میری ساڑھے بارہ کلے زمین ہے۔" یعقوب اعوان نے کہا۔
>
> "اوے بے عقلے" ہے کہاں؟ وہ تو ادھر رہ گئی۔ اب واپس جانے آنے کی بات چھوڑ۔ ادھر بے انت زمین خالی پڑی ہے۔ لوگ اٹھ اٹھ کر قبضہ کر رہے ہیں اب تو اپنی قوم میں آ گیا ہے۔ ادھر اوانوں میں اتفاق ہے۔ تین گھرانے متفق ہیں، تو بھی آ کر ساتھ مل جا رائے بشن داس کے دس مربعے خالی پڑے ہیں۔ ڈھائی ڈھائی ہر ایک کے حصے آ جائیں گے۔"[۱۳]

تقسیم کے اوائل میں ہی پاکستان کو شدید نوعیت کی اقربا پروری اور برادری نظام سے دوچار ہونا پڑا۔ اس ضمن میں حقداروں کو اپنے حقوق سے محروم ہونا پڑا۔ جعلی کلیموں اور الاٹ منٹوں نے پاکستان کو ابتدا ہی میں معاشرتی و معاشی مسائل سے نبرد آزما کردیا۔ اس طرح کی الاٹ منٹوں سے پاکستان میں نیا متوسط اور نو دولتیہ طبقہ پیدا ہوا، جس نے سماج کی اخلاقیات واقدار پر گہرا اثر ڈالا۔

پاکستان کے اس نئے معاشرے میں دو چیزوں کا تیزی سے اضافہ ہوا، ملوں اور مزدوروں کا، ساتھ ہی نئی اشرافیہ کی تخلیق بھی ہوئی۔ یہ اعلیٰ طبقہ ان افراد پر مشتمل تھا جنھوں نے اپنی زمینوں کے

ٹکروں پر چھوٹے کارخانے اور ملیں بنالیں تھیں۔اسی طرح طبقات کی تقسیم کا یہ سلسلہ سماج کی اونچ نیچ پر استوار رہا جیسا کہ پہلے زمانوں میں ہوتا رہا تھا۔عبداللہ حسین نے اس نئے معاشرے میں موجود آقا و غلام کو بھٹہ مالکوں اور بھٹہ مزدوروں کی شکل میں پیش کیا ہے۔کنیز اس طبقے کا نمائندہ کردار ہے جس سے ہماری ملاقات اعجاز کے ذریعے ہوتی ہے۔

> "ملک جی بچالو، اللہ کے نام پر رحم کرو ملک جی!" عورت اعجاز کی قمیض کھینچتے ہوئے بولی۔"میرے آدمی کو بچالو، ظالم اس کی جان لے لیں گی۔میری اور میرے بچے کی مدد کرو، تمھیں خدا کا واسطہ۔"
>
> —ایک کچے گھروندے کے سامنے سے لوگوں کو ہٹاتے ہوئے جب وہ دروازے تک پہنچے—دو تنومند آدمی ایک کالے کلوٹے، سوکھے سڑے آدمی کو پیٹ رہے تھے۔[۱۴]

اعجاز کے لیے یہ منظر تکلیف دہ تھا۔سکول کی ملازمت سے، اس سے استعفیٰ لے لیا گیا تھا جس کی خلش لے کر وہ ادھر اُدھر پھر رہا تھا اور اب یہ منظر اس کے سامنے تھا۔یہاں سے اعجاز کی زندگی بدل جاتی ہے۔

> "قصہ کیا تھا؟" اعجاز نے پوچھا۔
>
> "قصہ کیا ہوگا ملک جی! اپنے بچے کو دو دن سکول بھیجا ہے، بس یہ قصہ ہے۔"[۱۵]

کنیز کا کردار اس معاشرے میں بغاوت کی علامت بن کر ابھرتا ہے۔یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ کنیز ان لوگوں کا نمائندہ کردار ہے جنھوں نے اپنے حق کو پہچان لیا ہے۔یہاں عبداللہ حسین نے بھٹہ مالکان (اعلیٰ طبقہ) اور بھٹہ مزدور (نچلا طبقہ) کے درمیان منافرت اور کشمکش کو پیش کیا ہے اور اعجاز (متوسط طبقہ) دونوں کے درمیان توازن کی شکل میں موجود ہے۔

عبداللہ حسین نے جاگیردارانہ ذہنیت اور دوراندیشی کو بھی ناول میں موضوع بنایا ہے۔ملک جہانگیر ایک دوراندیش انسان ہے، ہر طرح کے حالات میں وہ اپنی پوزیشن برقرار رکھنا چاہتا ہے۔اس کا منشور برادری نظام ہے۔برادری کے اتحاد سے وہ مضبوط سیاست کو قائم کرنا چاہتا ہے۔ساتھ ہی وہ بدلتے ہوئے عہد پر بھی نظر رکھتا ہے اور خود کو اس کے مطابق استوار کرتا ہے۔ملک جہانگیر معاشرے کے اس طبقے سے تعلق رکھتا ہے جو اپنی نسل کو برقرار اور اوپر کے طبقے میں متعین دیکھنا چاہتا ہے۔اس کی

ساری اخلاقیات اس کے مقاصد اوراس کے مفادات کے زیرِ اثر متعین ہوتی ہیں۔ اس کا ہی درس وہ اعجاز کو بھی دیتا ہے۔

> اب ہماری نجات انڈسٹری میں ہے۔ اعجاز، ایوب خان کا ذہن انڈسٹری کی طرف ہے۔ کیا خبر کہ کل کو یہ زمینداروں کے ساتھ کیا کرے۔ خود یہ ہری پور کا رسالدار یا رسالدار کا بیٹا جو کچھ بھی ہے، زمینداری سے اس کا کوئی تعلق واسطہ نہیں — نہ جانے کس وقت یہ مارشل لا کے زور پہ زمینداروں کا پتا ہی صاف کردے۔ اسی لیے بھائی، ابھی سے دوراندیشی کرنی پڑے گی۔ جدھر کی ہوا چلے ادھر کو ہی منہ کرلو، فاصلہ جلدی طے ہوتا ہے۔[۱۶]

یہاں اعلیٰ طبقے کا ایک جاگیردار اتنا دوراندیش ہے کہ اگر جاگیرداری کارگر نہ ہو تو صنعتکار کے طور پر خود کو استوار کرلیا جائے۔ نئے صنعتی دور میں اختیارات کی نوعیت تبدیل ہوگئی ہے۔ ذاتی مزارعوں کی زندگیوں کے مالک یہ افراد وفاداریوں کو نئے طریقے سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ دراصل جاگیردارانہ نظام کے انہدام کے باوجود جاگیردارانہ ذہنیت (جس میں چھوٹے کسانوں اور مزدوروں کو ملکیت سمجھنے کا رجحان تھا) اب بھی ختم نہیں ہوا۔ اس لیے یہ اہلِ ثروت لوگ ان کی وفاداری کو نئے طریقے سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

> صنعتیں لگانا کوئی آسان کام نہیں۔ ان کی مشکلات بھی ساتھ ہی ہوتی ہیں۔ اب کی کمین مزارعے ملا جلا کر دو ڈھائی سو جانیں میرے رزق پر پلتی ہیں۔ ان میں سے ایک کی بھی مجال نہیں کہ میری بات کے آگے اونچ نیچ کرے۔ مگر مل میں یہ بات نہیں ہوتی۔ کوئی مزدور ہو یا کاریگر، یہ کسی کی رعایا نہیں ہوتے۔ آٹھ گھنٹے کام کیا اور گھر کی راہ لی۔ بیگار کا تو تصور ہی نہ کرو۔ اوور ٹائم کی تکرار، تنخواہ کا تقاضا پھر حکومت کی طرف سے سہولتیں، سال کے بعد چھٹیاں، بیماری کی چھٹیاں، ڈسپنسری بناؤ، ریسٹ روم بناؤ، یہ بناؤ، وہ بناؤ، کوئی تھوڑے بکھیرے ہیں؟ ابھی فیکٹری چالو نہیں ہوئی اور یونین بنانے کی باتیں ہورہی ہیں، باہر سے شرپسند لوگ آکر لیڈر بن جاتے ہیں۔
> ''ہاں''— زمین کی بادشاہت کہاں ملتی ہے؟''[۱۷]

''اب کی کمین مزارعے ملا جلا کر دو ڈھائی سو جانیں میرے رزق پر پلتی ہیں۔'' معنی خیز

جملہ ہے کہ یہ لوگ ان کی جانوں کے مالک ہیں ان کی محنت کا اعتراف جاگیردارانہ نظام میں نہیں بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ ان کے دیے رزق پر پرورش پا رہے ہیں۔ نچلا طبقہ محنت کرتا ہے اور اعلیٰ طبقہ اس پہ تصرف کرتا ہے ان کا احسان نہیں مانتا بلکہ اپنے احسان تلے ان لوگوں کی زندگیوں کا جوا کھیلتا ہے۔ دوسرا معنی خیز جملہ'' زمین کی بادشاہت کہاں ملتی ہے؟'' اس بات کا اشارہ ہے کہ جاگیردارانہ عہد کی فینٹیسی (fantasy) سے انسان کو نجات حاصل نہیں ہو سکتی۔

عبداللہ حسین نے متوسط طبقے کی رحم دلی کو اعجاز کے کردار کے ذریعے پیش کیا ہے۔ نیز یہ معاملہ بھی پیش کیا ہے کہ متوسط طبقے کے لوگ اپنی محنت سے معاشرے میں دولت اور مقام حاصل کرتے ہیں اور محنت اور محنت کرنے والے کی قدر کرتے ہیں۔ جب ایک محنتی انسانی کا حق نہیں ملتا تو اس کے لیے ہمدردی محسوس کرتے ہیں اور اپنی بساط کے مطابق ان کے لیے کام کرتے ہیں جیسا کہ اعجاز کے معاملے میں ہوا۔ مولانا بھاشانی کی تقریر اس پر گہرا اثر ثبت کرتی ہے اور وہ مزدوروں اور کسانوں کے حقوق کو زیادہ گہرائی سے سمجھ پاتا ہے۔

''مولانا بھاشانی کیا کہہ رہے تھے؟''

''کہہ رہے تھے کہ کسانوں، مزدوروں، غریب لوگوں کو ان کا حق ملنا چاہیے ...... جاگیرداران کو اپنی رعایا کے نام سے پکارتے ہیں اور اپنے مویشیوں کا سا بیگار کا کام ان سے لیتے ہیں۔''[۱۸]

ناول کا ایک اہم کردار سرفراز (اعجاز کا بھائی) کا ہے۔ سرفراز، اعجاز سے پندرہ برس چھوٹا ہے اور اس کی پرورش خود اعجاز نے کی ہے۔ وہ اسے پڑھا لکھا کر بڑا افسر بنانا چاہتا تھا مگر سرفراز نے اپنے لیے فوج کو پسند کیا۔ چنانچہ وہ فوج میں چلا گیا۔ ناول کی ابتدا فلیش بیک تکنیک سے ہوتی ہے۔ سرفراز فوج میں کپتان ہوا تو گاؤں میں اس کی خوب خوب شہرت ہوئی۔ جب سرفراز گھر آیا تو گاؤں کے صاحب حیثیت لوگ ملنے آئے اور خود کو اور اپنے گاؤں کو خوش نصیب سمجھا کہ ان کے گاؤں کا ایک نوجوان فوج کا افسر بنا ہے اور ان کی عزت میں اضافہ کیا ہے۔ شہر کی زندگی اور دیہات کی زندگی میں بہت فرق ہوتا ہے، اس کا احساس سرفراز کو بار بار رہتا ہے۔ خاص طور پر جب وہ اپنے ساتھی شعیب کی سالگرہ پر اس کے گھر جاتا ہے تو اس کا گھر دیکھ کر اسے اپنے طبقے اور شعیب کے طبقے میں فرق محسوس

ہوتا ہے۔ یہ فرق شہری طبقے اور دیہاتی طبقے کی سائیکی کا فرق ہے۔سرفراز کا یہ احساس اور قوی اس وقت ہوا جب شعیب کی بہن نسیمہ اور اس کی دوست نورین کیک لے کر آئے وہ بہت مرعوب ہوا، اس نے آج تک ایسی لڑکیاں نہیں دیکھی تھیں۔

> سرفراز پیشہ وری کی حد تک فوج کے حلقے میں کسی سے مرعوب نہ ہوتا تھا۔ مگر یہ ایک مختلف معاملہ تھا۔ اسے احساس تھا کہ وہ اپنی طبیعت، اپنے تجربے اور اپنے مخصوص طبقے کا قیدی تھا جس کی بنا پر وہ کھیل شروع کرنے سے پہلے ہی ہار گیا تھا۔[۱۹]

ماحول اور طبقے کی جو چھاپ شخصیت پر ہوتی ہے وہ ہمیشہ برقرار رہتی ہے۔عبداللہ حسین نے اس اقتباس میں اس طرف اشارہ کیا ہے اور سرفراز کو اس کے مخصوص طبقے کے نمائندے کے طور پیش کیا ہے۔

عبداللہ حسین نے اپنے ناولوں میں طبقات کی ہر سطح پر تفریق اور اس کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ دیہات میں طبقات کی ہر نوع جاگیردار، عام زمیندار، سرمایہ دار، بڑے کاروبار والا، چھوٹے آڑھت والے، مزدور اور مزارعے اور سب سے بڑھ کر برادری نظام کی تخصیص کو پیش کیا ہے۔مجموعی طور پر عبداللہ حسین نے اپنے ناولوں میں اپنے گہرے طبقاتی شعور کا اظہار کیا ہے۔

حوالہ جات

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، اسلام آباد ماڈل کالج، ایف۔سیون/فور، اسلام آباد۔

۱۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء)، ص ۲۶۔
۲۔ ایضاً، ص ۱۷۴۔
۳۔ ایضاً، ص ۲۲۷۔
۴۔ ایضاً، ص ۳۳۶۔
۵۔ ایضاً، ص ۴۳۳۔
۶۔ عبداللہ حسین، باگھ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء)، ص ۵۷-۵۸۔
۷۔ ایضاً، ص ۱۲۶۔
۸۔ عبداللہ حسین، قید (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء)، ص ۲۱۔
۹۔ ایضاً، ص ۵۷۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۴۸۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۰۰۔

۱۲۔ خالد اشرف، برصغیر میں اُردو ناول (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۵ء)، ص ۱۳۶۔

۱۳۔ عبداللہ حسین، نادار لوگ (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء)، ص ۸۴–۸۵۔

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۷۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۱۲–۱۱۳۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۲۲۰۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۲۳۱۔

۱۸۔ ایضاً، ص ۲۵۱–۲۵۲۔

۱۹۔ ایضاً، ص ۳۳۶۔

ماخذ

اشرف، خالد۔ برصغیر میں اُردو ناول۔ لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۵ء۔

حسین، عبداللہ۔ اداس نسلیں۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء۔

____۔ باگھ۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء۔

____۔ قید۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء۔

____۔ نادار لوگ۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء۔